بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(ڈاکٹر حافظ حسن مدنی)

# قانونِ امتناعِ توہین رسالت میں ترمیم کا مطالبہ؟

کسی ریاست کے یوں تو اسلامی ہونے کے متعدد معیارات اور پیمانے ہیں، تاہم ان میں سب سے نمایاں داخلی پیمانہ یہ ہے کہ وہاں اللہ کی شریعت نافذ ہو اور اس کی بنا پر لوگوں کے فیصلے کئے جاتے ہوں۔ اسی مقصد کے لئے پاکستان کو حاصل کیا گیا اور اسلامی احکامات کے فروغ کے ساتھ ساتھ شرعی قوانین کے نفاذ کے لئے یہاں بہت سے پر مشقت اور صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا۔

قیام پاکستان سے قبل ہی متحدہ ہندوستان میں دین اسلام سے نکاح وطلاق کے بعض قوانین رائج تھے، ۱۹۶۱ء میں اُن میں 'عائلی قوانین' کے نام سے متعارف کردہ اصلاحات کے ذریعے بہت سی خلافِ اسلام چیزیں شامل کر دی گئیں۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں بطورِ خاص قانون کو اسلامی بنانے کے لئے 'اسلامی نظریہ کونسل' کا وجود عمل میں لایا گیا۔ بعد ازاں صدر ضیاء الحق مرحوم کا دور اس لحاظ سے خوش آئند ہے کہ اس میں وفاقی شرعی عدالت، حدود قوانین اور آخری سالوں میں قانونِ توہین رسالت بھی متعارف کرایا گیا۔ اِسی دور میں جاری شدہ عدالتی عمل کے نتیجے میں قصاص ودیت اور شفعہ کے شرعی قوانین کتابِ قانون کا حصہ بنتے رہے۔ ضیاء الحق کا دور اس لحاظ سے دیگر تمام ادوار پر فائق ہے کہ انہی سالوں میں دیگر حکومتوں کے برعکس اسلام کے لئے بہت سے عملی اقدامات کئے گئے جبکہ بعد کے سالوں میں ان قوانین کو دوبارہ واپس کرنے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ حتیٰ کہ ضیا دور کا شریعت بل کا نعرہ، آخر کار جب ۱۹۹۱ء میں نواز حکومت نے عملاً منظور کیا تو اس میں اسلام کے بارے خوبصورت جذبات اور نیک خواہشات کے علاوہ عملی طور پر کوئی قدم شامل نہ تھا۔

گزشتہ برسوں میں وطن عزیز میں حدود قوانین کو غیر مؤثر کرنے کی بھرپور مہم چلائی گئی جس کی شدت اور نوعیت سے باخبر لوگ بخوبی آگاہ ہیں، اس کے نتیجے میں حقوقِ نسواں بل متعارف ہوا جس کی بعض دفعات کے غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ بھی انہی دنوں سامنے آچکا

ہے۔ حال ہی میں امتناعِ توہین رسالت کے قانون پر آسیہ مسیح کیس اور سلمان تاثیر کے قتل کے دوران شدید دباؤ دیکھنے میں آیا لیکن اس حساس موضوع پر دینی حلقوں کے جذبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے حکومتِ وقت نے اس معاملہ کو فوری طور پر ٹال دیا۔ الحاد و بے دینی کے اس دور میں قانون توہین رسالت کا یوں تحفظ بہر حال خوش آئند ہے!!

بظاہر تو یہ معاملہ فی الحال سرد پڑ چکا ہے، اور اس بارے میں حکومت و عوام کے مابین کوئی سرگرمی دکھائی نہیں دیتی، حتیٰ کہ بعض دینی رہنما مبارکبادی مضامین لکھ کر معاملے کو نمٹا بھی چکے ہیں لیکن پنجاب کے بعض علمی حلقوں نے اس قانون کو تاحال خصوصی دلچسپی کا موضوع بنایا ہوا ہے۔ ان کی کتب و جرائد میں یہ موضوع ایک مرغوب عنوان بن کر نت نئی تحقیقات سے وافر حصہ پا رہا ہے۔ یاد رہے کہ توہین رسالت کا موضوع مغرب میں جاری اہانت آمیز خاکوں اور قرآنِ مجید کے اوراق وغیرہ جلائے جانے، مزید برآں پاکستان میں مغرب زدہ این جی اوز کی دلچسپیوں اور گورنر سلمان تاثیر کے قتل کے بعد مزید حساسیت اختیار کر گیا ہے اور اس بارے میں بڑے محتاط انداز میں گفتگو کی جاتی ہے۔ اس تناظر میں بعض لوگ تو اس قانون کو سرے سے معطل کرنا چاہتے ہیں اور بعض ایسے اقدامات اور سفارشات تجویز کرتے ہیں جن کے نتیجے میں یہ قانون غیر مؤثر ہو کر رہ جائے۔

ماضی میں جب امتناعِ توہین رسالت کا قانون متعارف ہوا تو اس کی زمینی ضرورتوں اور واقعاتی وجوہ کے ساتھ ساتھ اس کو اس مرحلے تک لانے میں کم و بیش آٹھ برس کا عرصہ صرف ہوا تھا اور یہ پاکستان کے اہل علم کے متحدہ موقف کا ہی اعجاز تھا کہ ضیاء دور کی پارلیمنٹ کو باوجود کوشش کے اس قانون میں رخنے رکھنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ محض یاد دہانی کے لئے یہ اشارہ کرنا مناسب ہے کہ ۱۹۸۵ء کی پارلیمنٹ کے وفاقی وزیر قانون اقبال احمد خاں جب وفاقی شرعی عدالت کے مطالبے اور اسمبلی میں پیش کردہ بل کے بعد اس امر پر مجبور ہو گئے کہ امتناعِ توہین رسالت کا قانون '۲۹۵ سی' لے کر آئیں تو انہوں نے اس میں عمر قید کی سزا کا امکان بھی پیدا کر دیا جس کو بعد میں چھ سالہ مسلسل محنت کے بعد دوبارہ وفاقی شرعی عدالت نے حکومت کو نوٹس دے کر حذف کرایا اور ۱۹۹۲ء کی پارلیمنٹ سے ڈرامائی انداز میں اس پورے قانون کی تائید ہوئی۔

پاکستان میں جاری اسلامی قانون سازی کے بارے میں ہمارا اُصولی موقف، جو عرصۂ دراز سے محدث کے صفحات میں شائع ہو رہا ہے، یہ ہے کہ "حدود قوانین کو حدود اللہ بنایا جائے۔"

وضاحت اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ حق صرف قرآن وحدیث یعنی 'وحی الٰہی' کو ہی حاصل ہے کہ اس کی پابندی کو اللہ ربّ العزت کا منشا قرار دے کر عامۃ المسلمین پر نافذ کیا جائے۔ کتاب وسنت ہی معصوم ہیں، ان میں غلطی کا کوئی امکان نہیں اور کتاب وسنت ہی قیامت تک غیر متبدل اور دائمی شریعت ہیں، ہر قسم کے معاشرے اور ہر دور میں ان کی پیروی کرنا مسلمانوں پر فرض ہے جبکہ کتاب وسنت سے مستنبط بہتر سے بہترین قانون یا فقہ اسلامی بھی، چاہے وہ ائمہ اسلاف کی مرتب کردہ ہو، عصمت کا مقام ومرتبہ نہیں پاسکتی۔ فقہاے عظام کی فقہی آرا میں تعدد واختلاف اس امر کی دلیل ہے کہ ان میں سے حق اور منشائے الٰہی کسی ایک موقف کے ساتھ ہے، اور تمام فقہی آرا بیک وقت حق نہیں ہیں۔ ائمہ فقہا کی آمد اور فقہی جہود ومساعی سے قبل بھی خیر القرون میں کتاب وسنت پر ہی عمل ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے شریعتِ اسلامیہ کے کسی بھی موقف کو پہلے قانونی الفاظ کی شکل دے کر نافذ کرنا دراصل شریعتِ اسلامیہ کے نام پر بعض ایسے فاضل انسانوں کی شرعی رائے (فقہ) کو نافذ کرنا ہے جن سے غلطی کا صدور ہوسکتا ہے۔ ایسے قوانین کبھی غلطی سے کلّی طور پر پاک نہیں ہوسکتے اور ان پر تمام مسلم اہل علم کا حقیقی اور کلّی اتفاق اَمر محال ہے جس پر مسلمانوں میں قانون سازی کی مختصر تاریخ شاہدِ عدل ہے۔ الغرض ضرورت اس بات کی ہے کہ کتاب وسنت کو براہِ راست نافذ کیا جائے اور اس کے لئے ماہرین شریعت کو تیار کیا جائے۔ یہ ماہرین شریعت کتاب وسنت کے معنٰی ومفہوم کے تعین کے لئے فقہائے عظام کی تحقیق وتدقیق سے آزادانہ استفادہ کریں، لیکن کسی شخص کو سزا وجزا، کسی انسان یا بعض انسانوں کے متعین کردہ قانونی دفعہ کی بجائے، اللہ ربّ العزت کے قول ومراد (قرآن وحدیث) کی بنا پر ہی دی جائے۔ اسی میں تقدس ہے اور یہی قرآنی حکم ﴿لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ...﴾ کا تقاضا ہے!!

مزید برآں ہمارے مروّجہ جمہوری نظام کو کسی شرعی حکم کو قانون قرار دینے کے پیچھے جو قوت کارفرما ہے، وہ 'دلیل شرعی' کی بجائے ووٹنگ کی قوت پر استوار ہے۔ اس بنا پر پاکستانی معاشرے میں زکوٰۃ دینا یا شراب کا ممنوع ہونا اس پر موقوف نہیں کہ یہ قرآن وسنت کا حکم ہے، بلکہ اس بنا پر ممنوع ہے کہ عوامی نمائندوں کی اُس اکثریت نے اس قانون کو پاس کیا ہے جو شریعتِ اسلامیہ سے ناواقف ہے۔ اس بنا پر ان بظاہر شرعی قوانین کی اطاعت کیا اللہ کی اطاعت شمار ہوگی یا جمہوریت کے عوامی نمائندوں اور نظام کی؟ ظاہر ہے کہ اسلامی قوانین کی

تاثیر اور نفاذ کا یہ پہلو بھی خصوصیت سے توجہ کا متقاضی ہے!!

## اسلامی قوانین میں اختلافِ رائے کا مسئلہ

اس موقف کو پیش نظر نہ رکھنے کا نتیجہ ماضی میں بھی یہ نکلتا رہا کہ وہ حدود قوانین جنہیں بڑے خلوص کے ساتھ علماے کرام اور قانونی ماہرین نے مرتب کیا تھا، ان کی تعبیر اور درست ہونے پر آج تک متعدد آرا پائی جاتی ہیں۔ ہر کسی عالم وفقیہ کی تعبیر دوسرے صاحب علم کے رجحان سے لگا نہیں کھاتی اور وہ اس سے اختلاف کر بیٹھتا ہے!!

① جو لوگ آج ان حدود قوانین کی برملا تائید کرتے ہیں، وہ بھی اس بنا پر ایسا کرتے ہیں کہ اُن میں شریعتِ محمدیہ پر عمل کرنے کا داعیہ اور جذبہ موجود ہے، اس لئے اُصولی طور پر ان کی تائید ہونی چاہئے، نہ کہ اس بنا پر کہ یہ اسلام کے عین مطابق ہیں۔

② ان اسلامی قوانین میں غلطی اور اصلاح کی بات آج وہ لوگ بھی کہہ رہے ہیں جو ان اسلامی قوانین میں ترمیم کے داعی ہیں جبکہ ماضی میں یہ قوانین انہی حضرات کے کبار علماے کرام کی مشاورت اور تائید سے مرتب ہوئے ہیں۔

③ جبکہ سیکولر طبقوں کو اسی بنا پر یہ بہانہ اختیار کرنے کا بھی موقع ملا ہے کہ پاکستان میں مروّج اسلامی قوانین کا شرعی تشخص قابل غور ہے اور ان کی بنا پر شرعی آثار مرتب ہونے میں ایک سے زیادہ آرا ہو سکتی ہیں کیونکہ یہ قوانین کون سے اللہ کے الفاظ ہیں؟ یہ بھی تو ہماری طرح انسانوں کی ہی تعبیر ہیں جن میں کمی بیشی اور غلطی کا امکان موجود ہے۔ اس بنا پر ان قوانین کو ہدفِ تنقید بنانا یا اُنہیں 'سیاہ قانون' قرار دینے سے کونسا شریعتِ اسلامیہ پر حرف آتا ہے؟

④ حال ہی میں جو لوگ قانون امتناع توہین رسالت کی مزعومہ اصلاح کے لئے میدان میں اُترے ہیں، وہ ماضی میں ہونے والی ایسی کاوشوں کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"جنرل پرویز مشرف کے دور میں حدود قوانین میں ترمیم کی ضرورت کے حوالے سے ذرائع ابلاغ میں بحث مباحثہ کا میدان سجایا گیا تو مذہبی حلقوں نے ابتدا میں سارا زور یہ ثابت کرنے پر صرف کیا کہ یہ قوانین اعلیٰ سطحی اسلامی ماہرین نے بہت گہرے غور وفکر اور مشاورت کے بعد بنائے ہیں اور ان میں جو خلا یا نقائص بتائے جاتے ہیں، وہ بے بنیاد ہیں، اس لئے ان میں کسی ترمیم کی ضرورت نہیں۔ تاہم آخر

کار علما کی ایک کمیٹی نے ان میں سے بعض قوانین کو شرعی لحاظ سے قابل اصلاح تسلیم کرتے ہوئے خود ان میں ترمیم کے لئے تجاویز پیش کیں۔ اس سارے عمل سے ذہنوں میں ایک سوال تو یہ پیدا ہوا کہ اگر قانون میں خامیاں موجود تھیں تو گزشتہ تیس سال میں مذہبی حلقوں نے ان کی اصلاح کے لئے کوشش کیوں نہیں کی اور ہر موقع پر یہ اِصرار کیوں کیا جاتا رہا کہ ان قوانین کو چھیڑنا حدود اللہ اور احکام شرعیہ میں مداخلت کے مترادف ہے۔''[1]

## قانون توہین رسالت میں تجویز کردہ ترامیم

اس تحریر کے مصنف نے اس اساس پر اپنے تئیں قانون توہین رسالت کے ضمن میں ایک متبادل موقف پیش کرنے کی سعی کی ہے جو ان کے تفصیلی مضامین اور ان کے زیر ادارت مجلّہ کے صفحات پر پھیلی نظر آرہی ہے۔ اپنے مضمون کے آخر میں اُنہوں نے واضح الفاظ میں اس ساری تحقیقی جدوجہد کا ہدف بھی واضح کر دیا ہے، لکھتے ہیں:

''توہین رسالت سے متعلق حالیہ قانون چند بنیادی اور اہم پہلوؤں سے نظر ثانی کا محتاج ہے، اس لئے جید اور ذمہ دار علما کی راہ نمائی میں مذہبی جماعتیں درج ذیل اُمور کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ترمیم شدہ اور جامع مسودۂ قانون پارلیمنٹ میں پیش کریں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) جو شخص بھی دانستہ اسلام یا پیغمبر اسلام کی توہین کرے، اس کو پاکستان کے شہری حقوق سے محروم کر دیا جائے۔ (۲) اس جرم میں افراد کی بجائے پاکستان کی ریاست کو مدعی ہونا چاہئے۔ (۳) پہلی مرتبہ جرم سرزد ہونے پر مجرم کو توبہ، معذرت اور معافی کا موقع دیا جائے، اگر اس کی بدنیتی ثابت ہو جائے اور اصلاحِ احوال نہ ہو تو اُس کی توبہ کو قبول نہ کیا جائے۔ (۴) جرم کی نوعیت اور اثرات کے پیش نظر کم تر سزاؤں کی گنجائش رکھی جائے اور موت کی سزا، اس جرم کی انتہائی صورت میں اُسی وقت ہی دی جائے جب جرم کا سدباب اور اس کے اثرات کا ازالہ اس کے بغیر نہ ہوتا ہو۔''[2]



---

۱ ماہنامہ 'الشریعہ' گوجرانوالہ... شمارہ جون ۲۰۱۱ء، ص ۵۳
۲ ایضاً: ص ۵۵ ملخصاً

یہ ہے ناموس رسالت کے مسئلہ پر کئی ماہ سے جاری بحث مباحثہ کا حاصل اور مدعا۔ مذکورہ بالا ترمیمی کاوش پر ہماری معروضات حسبِ ذیل ہیں:

## حدود قوانین پر قومی بحث مباحثے کا نتیجہ؟

ناموسِ رسالت کے تحفظ اور سزا کے جائزہ سے قبل، حدود قوانین کے سلسلے میں مضمون نگار نے جس بحث مباحثہ کا حوالہ دیا ہے، پہلے ہم اس کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہیں کیونکہ اس سے زیر بحث مسئلہ پر مفید رہنمائی حاصل ہوگی۔ یہ درست ہے کہ حدود قوانین سو فیصد اسلامی نہیں بلکہ اس میں بہت سی خامیاں ہیں، تاہم اس قانون کو ترتیب دینے والے علما کے پیش نظر یہ تھا کہ پاکستانی معاشرے میں اینگلو سیکسن سزاؤں کی بجائے شرعی سزائیں جاری کی جائیں جو پاکستان کے قیام کا مقصد بھی ہے۔ اسی بنا پر علما کی طرف سے اس کی تائید کی جاتی رہی جبکہ محقق موصوف جیسے بہت سے سکالر اُس وقت قوم کو حدود اسلامی پر مروّجہ موقف اور اس قانون کی خامیاں گنوانے میں لگے ہوئے تھے۔ ابھی قارئین کو وہ دور بھولا نہیں ہوگا جب جاوید احمد غامدی اور ان کے رفقا جنگ گروپ کے 'ذرا سوچئے' ایجنڈے کے زیر عنوان 'محققانہ سوچ' کو پروان چڑھانے میں مصروف تھے۔ غامدی صاحب کے اس انتشارِ فکری اور محققانہ سرگرمی کا یہ نتیجہ تو کہیں برآمد نہیں ہوا کہ مشرف حکومت نے اُن سے مشاورت کر کے حدود قوانین میں وہ اصلاح کر دی جو اُن کا منشا تھی، تاہم حکومت اور سیکولر طبقے نے اُن کی تحقیق سے یوں استفادہ کیا کہ عوام الناس میں انتشار اور علمائے کرام کو فکری ہزیمت سے دوچار کرنے کے لئے اُن کے ٹی وی پروگراموں اور مضامین کو بڑھا چڑھا کر نشر کیا اور اس کے نتیجے میں 'ویمن پروٹیکشن بل' کے نام سے ایسا بل لے آئے جو حدود قوانین سے کہیں زیادہ غیر اسلامی تھا۔ اس بل کے غیر اسلامی ہونے پر پاکستان کے تمام معروف و مسلّمہ دینی حلقے متفق و متحد تھے۔ اب یا تو جاوید احمد غامدی اور ان کے رفقا اس بل کے عین اسلامی یا کم از کم حدود قوانین کی بہ نسبت اسلام سے قریب تر ہونے کا دعویٰ کریں تو ان کو حقیقت کا آئینہ دکھایا جائے اور غامدی محققین کے لئے آج توہین رسالت کے قانون کے لئے ویسی ہی محققانہ سرگرمی کا جواز قبول کیا جائے۔ ہمارے خیال میں غامدی محققین حدود قوانین کے مرحلے پر سیکولر مقاصد اور مغرب نواز ایجنڈے کے لئے اس بری طرح استعمال ہوئے کہ اِس کو کم از کم الفاظ میں شرم ناک اور عبرت آموز قرار دیا جاسکتا ہے۔ آج پاکستانی قوم پر

ویمن پروٹیکشن بل کی صورت میں جو شرمناک قانون مسلط ہے، اس کو نافذ کرنے کے سلسلے میں جاوید غامدی کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور وہ عند اللہ اس کی مسئولیت سے بری نہیں ہوں گے، کیونکہ مروّجہ حدود قوانین کی خامیاں پیش کرنے میں جو نکتہ رسیاں اُنہوں نے دکھائی تھیں، اس میں کوئی دوسرا حلقہ اُن کا سہیم وشریک نہیں تھا۔

## حالیہ مباحثے سے مطلوبہ اصلاح کیونکر برآمد ہوگی؟

قانون توہین رسالت میں اصلاح ممکن ہے اور ہم بھی اس میں بعض اصلاحات پیش کرسکتے ہیں، مثلاً اس میں توہین کی یہ سزا صرف ذاتِ گرامی ﷺ کی حد تک خاص ہے، جبکہ شریعتِ اسلامیہ کا تقاضا ہے کہ یہ سزا تمام انبیاے کرامؑ کی اہانت تک وسیع ہو اور وفاقی شرعی عدالت نے اپنے فیصلے میں اس نکتہ کو شامل بھی کیا تھا، لیکن چونکہ اس وقت پاکستان میں مروّجہ قانون، وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے بعد پارلیمنٹ کی ۱۹۹۲ء میں پاس کردہ قانون سازی کی بنا پر نافذ العمل ہے، اس لئے یہ پہلو اس میں موجود نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ قانون توہین رسالت کا اصل اعتبار اور اعتماد، ضیادور کی اسمبلی اور وفاقی شرعی عدالت کی بجائے ۱۹۹۲ء کی اسمبلی اور سینٹ کے متفقہ فیصلے پر ہے اور یہ خالص جمہوری تقاضے پورے کرنے والا ملکی قانون ہے۔

اصلاح کے بعض نکات کو اپنے تئیں تلاش کرلینا اور اس کو مشتہر کرنا، جبکہ وہ اصلاح بھی درحقیقت اصلاح کی بجائے افساد ہی ہو، کوئی ایسا مشکل امر نہیں۔ لیکن اگر مجلہ 'الشریعہ' کے مدیر محترم پاکستان میں شرعی قوانین کا فروغ چاہتے ہیں تو اُنہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ حکمران اور یہ دور اس مقصد کے لئے قطعاً موزوں نہیں۔ ان کی یہ 'فاضلانہ کوششیں' صرف مروّجہ قانون اور معروف موقف کو، جو اُمتِ مسلمہ کی ایک عظیم اکثریت بلکہ قرآن وسنت کا براہِ راست منشا بھی ہے، متاثر کرنے کا ہی سبب بنیں گی اور ان کی دانشورانہ سرگرمیاں ان لوگوں کے لئے تحقیقی غذا کا کام دیں گی جو اس قانون کو مسخ کرکے آخرکار بے اثر کردینا چاہتے ہیں۔ وہ حکومت سے بڑی معصومیت سے یہ مطالبہ اس اعتماد کی بنا پر کررہے ہیں، گویا ان کی نظر میں ہماری حکومت کی منشا ومراد بھی یہ ہے کہ وہ اسلامی احکامات کو نافذ کریں۔ کیا اُنہیں اس حکومت کا جناب صوفی محمد کی نظامِ عدل کی تحریک کے ساتھ کیا گیا حشر یاد نہیں یا وہ اس حکومت کی امریکہ نوازی اور اسلام دشمنی کے تمام اقدامات کو مبنی برانصاف سمجھتے ہیں جو

اُن سے یہ معصومانہ توقع رکھتے ہیں؟

محقق موصوف کے علم میں ہونا چاہئے کہ ۱۹۹۲ء کے واضح جمہوری فیصلے اور عدالتی احکامات کے بعد جب پاکستانی حکومتوں کے لئے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ قانون امتناع توہین رسالت کو بدل سکیں تو پہلی بے نظیر حکومت نے اس قانون کے اجرا میں ہر ممکن روڑے اٹکائے۔ ۱۹۹۴ء میں اس کو پولیس کی ذمہ داری (یعنی ریاست کے خلاف جرم) سے نکال کر سیشن کورٹ یا مجسٹریٹ کے پاس بطورِ استغاثہ درج کرنے کا تنگ راستہ مقرر کیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں حکومت کو توہین رسالت کے جرم سے کوئی سروکار نہ رہا، اور یہ عوام پاکستان کا مسئلہ قرار پایا کہ اگر وہ پریشانی محسوس کریں تو سیشن جج یا مجسٹریٹ کے پاس جاکر فریاد کناں ہوں۔ پھر دوسری نواز شریف حکومت نے ۱۹۹۸ء میں اس جرم کے اندراج کے لئے ایسے چھ افراد پر کمیٹی بھی ضروری قرار دے دی جس میں دو عیسائی افراد اور ایک ڈپٹی کمشنر اور ایک ایس ایس پی شامل ہوں۔ پھر مشرف حکومت نے ۲۰۰۴ء میں اس جرم کی تفتیش کے لئے ضروری قرار دیا کہ ایس پی سے نچلے درجے کا کوئی افسر اس کیس کی تفتیش کرنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ ان تمام تر تبدیلیوں کے باوجود بھی جب توہین رسالت کا کوئی وقوعہ پوری شدت سے رونما ہو جاتا ہے تو اُس وقت اِسی حکومت کا مدار المہام صدر زرداری اپنے نمائندے سلمان تاثیر کو شاتمہ رسول کے لئے یہ بشارت سنانے بھیجتا ہے کہ تمہیں بے فکر ہو جانا چاہئے۔ حکومتوں کے انہی رجحانات اور بعض اقدامات کا نتیجہ ہے کہ آج ۱۹ برس گزر جانے کے باوجود بھی پاکستان میں توہین رسالت کے کسی ایک مجرم کو بھی سزائے موت نہیں ہو سکی۔ تاریخ کی ان مستند گواہیوں کے بعد بھی حکومت کے رجحانات میں خوش فہمی کی توقع رکھنا، اس کو ترمیم کی دعوت دینا اور اس سے اصلاحِ احوال کی اُمید رکھنا نری سادگی ہے!

## مجوزہ ترامیم پر ایک ناقدانہ نظر

یوں تو مضمون نگار کی موجودہ قانون میں مجوزہ تبدیلیاں ہی ان کے رخ کا بخوبی پتہ دے رہی ہیں لیکن اس جرم میں حکومت کو مدعی بنانا تو بالکل نامناسب ہے۔ اس کے غلط مضمرات یہ ہوں گے کہ حکومتِ وقت جب چاہے گی اس جرم کی نوعیت میں ترمیم و تبدیلی کر سکے گی یا اپنے دعوی سے دستبردار ہو جائے گی اور یہ جرم معاشرے میں ہوتا رہے گا۔

موصوف اس جرم کو جس ہلکے پھلکے انداز میں لے رہے ہیں، اسے بھی کم سے کم الفاظ

میں افسوس ناک ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔ مجرم کے شہری حقوق کا خاتمہ کوئی بڑی سزا نہیں، کیا پاکستان کے دیگر شہریوں کے حقوق پوری طرح ادا ہو رہے ہیں جو اِسے اب ایک سزا کے طور پر متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔ اور توبہ کے انکار کے باوجود مجرم کو سزائے موت نہ دینا بھی نرا مذاق ہے۔ موصوف تو سزائے موت کو صرف اُسی حالت میں گوارا کر رہے ہیں، جب یہ جرم انتہائی درجے میں وقوع پذیر ہو اور اس جرم کے انسداد کی اس کے سوا کوئی اور صورت نہ ہو۔ توہین رسالت کی یہ مجوزہ سزا شرعِ اسلامی میں کہیں نہیں پائی جاتی...!!

① اگر کسی ریاست میں اسلامی احکامات کی یہ حالت ہو جیسا کہ پاکستان میں ہے تو اس وقت اہل دین کو چاہئے کہ اتفاق واتحاد کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو کچھ موجود ہے، اسی کو غنیمت جانیں۔ نہ کہ پہلے سے حاصل کردہ کامیابیوں میں 'مزید اصلاح کے جذبے سے' خامیاں نکالنا شروع کردیں جس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حکومتِ وقت اُنہیں اس سے بھی محروم کردے۔

② کیا اس بات کو موجودہ قانون کی اصلاح قرار دیا جائے یا تخریب؟ کہ اہانتِ رسول کے جرم کو قابل توبہ قرار دے کر مجرم کے تکرار اور شدتِ جرم کا انتظار کیا جائے۔ اس دور میں پیغمبر اسلام کی اہانت کو جس بڑے پیمانے پر معمول بنالیا گیا ہے اور دنیا بھر کا میڈیا اور حکومتیں اسے اظہارِ رائے کا حق جتانے پر تلی ہوئی ہیں، اس تناظر میں اس جرم کی روک تھام پوری شدت سے ہونی چاہئے۔ کم از کم مسلمانوں کے ممالک میں تو حرمتِ رسولؐ کی پاسداری اشد ضروری ہے۔ آج مسلم ممالک میں جو بدبخت توہین رسالت کا ارتکاب کرتا ہے، اس کو غیر معمولی پروٹوکول دیا جاتا اور اس کو این جی اوز سپانسر کرتی ہیں، دنیا بھر سے اس کی حمایت میں بیانات جاری کئے جاتے ہیں۔ آسیہ مسیح یا مختاراں مائی کی اس کے سوا کیا اہمیت ہے کہ ایک نے رسولِ رحمت ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے اور دوسری پاکستان کو رسوا کر رہی ہے اور اسی جرم کی بدولت عالمی چرچ اور دنیا بھر کے میڈیا کی آنکھوں کا تارا بنی ہوئی ہیں۔ الغرض جب بھی اسلام کے نام پر کسی جرم کا سزا کا مسئلہ درپیش ہو تو دنیا بھر کی دلچسپیاں اس میں دیدنی ہوتی ہیں۔

③ یہ بھی یاد رہے کہ ائمہ فقہا کے مابین اہانت رسول کے مرتکب کی توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کے مابین جو اختلاف پایا جاتا ہے، اس میں اُن کے ادوار اور موجودہ ادوار کا فرق

بھی ملحوظ رہنا چاہئے۔ غلبہ اسلام یا خلافتِ اسلامیہ کی موجودگی میں کوئی بدبخت اگر اہانتِ رسول کا ارتکاب کرتا تو اہل اسلام اس کا سدباب کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، جبکہ آج کھلم کھلا اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول ﷺ کی ناموس کو پامال کیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے بے غیرت حکمران اس پر اک حرفِ مذمت بھی ادا نہیں کرتے۔ مسلم ممالک میں غیر مسلم لوگ، اسلامی شعائر کو پامال کرکے، اسے اپنے مابین عزت وافتخار کا وسیلہ بناتے ہیں اور دنیا بھر کا کفر ان کی پشت پر جمع ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اس دور میں توبہ کی گنجائش میسر کردینا، تو نبی اسلام ﷺ کی ناموس کو غیروں کے ہاتھ میں کھلونا بنادینے کے مترادف ہے۔

ہمارے مخاطب چونکہ حنفی علماے کرام ہیں اور ان کے ہاں توہین رسالت کے ایسے مجرم کے لئے جو ذمّی[1] ہو، قانونی رعایت کے موقف کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر مصر کے ایک حنفی محقق زاہد الکوثری کا موقف ملاحظہ فرمایئے کہ انہوں نے ایسے حالات میں فقہ حنفی کا منشا یہ قرار دیا ہے کہ جب ذمیوں کی ایسی حالت ہو تو اس وقت امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی ان کا عہدِ ذمہ ٹوٹ جائے گا اور وہ واجب القتل ہوں گے، لکھتے ہیں:

إن أبا حنيفة يرٰى أن لا انتقاض لعهد أهل الذمة بشيء من ذلك إلا أن يكون لهم منعة يقدرون معها على المحاربة أو أن يلتحقوا بدار الحرب فمتٰى انتقض عهدهم أبيح قتلهم متى قدر عليهم[2]

"امام ابوحنیفہ کی رائے میں اس جرم کے ارتکاب سے اہل ذمہ کا معاہدہ نہیں ٹوٹتا۔ وہ صرف اس وقت ٹوٹتا ہے جب وہ ایسی جتھہ بندی کرلیں جس کے بل بوتے پر اُنہیں جنگ کی قوت حاصل ہوجائے یا دارالحرب میں چلے جائیں۔ چنانچہ جب ان کا معاہدہ ٹوٹ جائے تو جب بھی ان پر قدرت حاصل ہو، اُنہیں قتل کرنا مباح ہوگا۔"

اسی سے ملتی جلتی بات امام مرغینانی کی 'الہدایہ' میں بھی اِن الفاظ میں موجود ہے:

ولا ينتقض العهد إلا أن يلتحق بدار الحرب أو يغلبوا على موضع فيحاربوننا

---

۱ دارالاسلام میں ادائیگی جزیہ کی بنا پر امان یافتہ غیر مسلم

۲ النکت الطریفہ: ص ۱۳۳ بحوالہ کتابچہ 'توہین رسالت کا مسئلہ': ص ۵۸

”معاہدہ اس وقت ٹوٹ جائے گا جب ذمّی دار الحرب میں چلا جائے یا اہل ذمہ کسی علاقے پر قبضہ کر کے ہمارے خلاف بر سرِ پیکار ہو جائیں۔“[1]

فی زمانہ توہین رسالت کے مرتکبین کو فوری طور پر مغربی ریاستیں اپنے پاس اس تیزی سے بلا لیتی ہیں کہ مسلمانوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی، جیسے نواز شریف کے اوّل دور میں جرمنی میں دو شاتمانِ رسول کرامت اور سلامت مسیح کو تحفظ دیا گیا اور سلمان رشدی کو لندن میں تا حال تحفظ ملا ہوا ہے۔ اور پورا مغربی میڈیا اور حکومتیں، مع عالمی عیسائی چرچ ان کی تائید کے لئے اہل اسلام کے خلاف معنوی جنگ برپا کر دیتے ہیں۔ ایسے بدبختوں کی خصوصی مہمان نوازی کی جاتی اور ان کے تحفظ پر لاکھوں ڈالر صرف کئے جاتے ہیں۔

④ مزید برآں ایسی صورتحال میں شریعت کے ان احکام کو پیش کرنا جو خلافتِ اسلامیہ کی موجودگی میں پیش کئے گئے اور ان کی بنا پر ایسے مجرمین کی رعایت کا موقف اپنانا درست نہیں کیونکہ شرعی احکام کا اطلاق مختلف افراد اور حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے بھی صورتِ حال کی رعایت کرتے ہوئے

رخص في القبلة للشيخ وهو صائم، ونهى عنها الشاب وقال: «الشيخ يملك إربه، والشاب يفسد صومه»[2]

”نبی کریم ﷺ نے بوڑھے شخص کو روزہ کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لینے کی اجازت دی اور نوجوان کو اس سے منع کر دیا اور فرمایا: کیونکہ بوڑھا شخص اپنی شہوت پر قابو رکھتا ہے اور نوجوان اس بنا پر اپنے روزے کو فاسد کر بیٹھے گا۔“

امام سبکی نے امام مالک کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے یہی بات بیان کی ہے:

وقد يحصل بمجموع أمور حكم لا يحصل لكل واحد منها وهذا معنى قول مالك: يحدث للناس أحكام بقدر ما يحدث لهم من الفجور فلا نقول إن الأحكام تتغير بتغير الزمان بل باختلاف الصورة الحادثة فإذا حدثت صورة على صفة خاصة علينا أن ننظر

1 الہدایہ: ۲/ ۱۶۳

2 السنن الصغیر للبیہقی: ج ۳/ ص ۲۶۶، صحیح بخاری: ۲۹۱، سنن ابن ماجہ: ... علامہ عبد الرحمن مبارکپوری نے بھی تحفۃ الاحوذی میں زیر حدیث ۳۳۹ اسی موقف کو ترجیح دی ہے۔

فیها فقد یکون مجموعها یقتضي الشرع له حکمًا[1]

"بسا اوقات متعدد اُمور کے مجموعہ پر جو شرعی حکم لگتا ہے، وہ حکم اس کے ہر ہر جزء پر صادق نہیں آرہا ہوتا اور یہی امام مالک کے اس قول کا مفہوم ہے کہ جوں جوں لوگ فسق وفجور میں مبتلا ہوتے جائیں گے، ان کے لئے احکام میں تبدیلی ہوتی جائے گی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ شرعی احکام زمانے کی تبدیلی کی بنا پر بدل جاتے ہیں، بلکہ نئی پیدا شدہ صورتحال کی بنا پر احکام کے اطلاق میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ جب بھی کوئی مخصوص صورت حال پیدا ہو تو ہمیں چاہئے کہ اس میں از سر نو غور کریں کیونکہ بعض اوقات حالات کا نیا مجموعہ شریعت کے دوسرے حکم کا متقاضی ہوتا ہے۔"

## پاکستان کے غیر مسلم، شرعی ذمّی کا مصداق نہیں!

متعلقہ مجلّہ میں شائع کئے جانے والے مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ بعض حنفی فقہا کے نزدیک توہین رسالت کی سزا ذمّی کے لئے وہ نہیں جو اس وقت مروّجہ قانون میں متعارف کرائی گئی ہے۔ بالفرض اس بات کو تسلیم بھی کرلیا جائے کہ فقہ حنفی کے بعض فقہا کا موقف یہی ہے کہ ذمّی کے سلسلے میں ضروری ہے کہ اس کو موت کی سزا شرعاً نہ دی جائے بلکہ عوام المسلمین اور سیاسی مصالح کے پیش نظر دی جائے تو اس سے ہمارے پیش نظر حالات میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ فقہاے کرام نے جس دور میں یہ تقسیم کی تھی، وہ دارالاسلام اور دار الکفر/الحرب/العہد وغیرہ کا دور تھا۔ جبکہ پاکستان میں بسنے والے غیر مسلم، جنہیں ذمی قرار دے کر ان کے بارے میں رعایت کا موقف پیش کیا جارہا ہے، نہ تو شرعی معنوں میں ذمّی ہیں کیونکہ وہ جزیہ ادا نہیں کرتے، اور نہ ہی وہ کمتر حیثیت کے شہری بننے پر قانع ہیں بلکہ وہ تو برابر کے شہری ہونے کے دعویدار ہیں۔ ذمی، معاہد اور مسلم ہونے کی تقسیم تو اُن ریاستوں میں ہوتی ہے جو اسلامی ڈھانچے اور نظریاتی اساس پر قائم ہوں، ان میں خلافت وعدالت سمیت تمام اسلامی نظام جاری وساری ہوں، جبکہ موجودہ ریاستیں وطنی اساس پر جدید نیشنل سٹیٹس ہیں جن میں مغرب کا جمہوری نظام کارفرما ہے۔ اس جمہوری نظام کی بنا پر ہی ہمارے ہاں غیر مسلم حضرات ذمّی کا تشخص اپنانے پر آمادہ نہیں ہیں۔ موصوف کے مضمون میں ہی ذمی کے بارے میں یہ فقہی جزئیہ بھی پیش کیا گیا ہے جس سے حنفی فقہا کا منشا بخوبی معلوم ہوتا

---

1 فتاویٰ سبکی: ۲/۵۷۲

ہے، نامور حنفی فقیہ علامہ زین الدین ابن نجیم لکھتے ہیں:

ولا ينتقض عهد بالإباء عن الجزية والزنا بمُسلمة وقتل مسلم وسب النبي ﷺ لأن الغاية التي ينتهي بها القتال التزام الجزية[1]

''ذمی اگر جزیہ دینے سے انکار کرے یا کسی مسلمان عورت کے ساتھ بدکاری کرے، یا کسی مسلمان کو قتل کردے، یا نبی ﷺ کی توہین کرے، تو اس سے اس کا معاہدہ نہیں ٹوٹے گا، کیونکہ وہ غایت جس پر قتال رک جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ذمی جزیہ ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کرلے۔''

علامہ ابن نجیم نے جس ذمّی کو یہ ساری گنجائشیں عطا کرنے کا موقف پیش کیا ہے وہ اُس کا جزیہ ادا کرنے کی پابندی کو قبول کرنا ہے۔ اب کیا پاکستان میں موجود غیر مسلم جزیہ ادا کرتے ہیں؟ قرآنِ کریم نے بھی جزیہ کا یہ واضح اُصول بیان کیا ہے:

﴿حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾

''حتی کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں۔''

فاضل شہیر ڈاکٹر محمود احمد غازی بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ ماضی کی دار الاسلام اور دارالکفر یعنی نظریاتی ریاستوں کے دور کی بحثوں کو موجودہ وطنی ریاستوں کے دور میں از سر نو دیکھنا ضروری ہے کہ اب ان اصطلاحات کے معانی اور اطلاقات بدل چکے ہیں۔

لہٰذا پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں پر شرعِ اسلامی کے وہ احکام لاگو ہوں گے جو کافر کے بارے میں ہیں، اور کافر کے بارے میں احادیثِ نبویہ کی دلالت واضح ہے کہ آپ کے دور میں کئی یہودیوں اور مشرکین کے علاوہ یہودی عورت کو بھی شتم رسول کی بنا پر سزائے موت دی گئی۔ اور کافر شاتم کے بارے فقہ حنفی میں بھی کوئی اختلاف نہیں، بعض احناف کا اختلاف تو ذمیوں کے بارے میں ہے۔ جیسا کہ صاحب 'در مختار' علامہ حصکفی حنفی نے واضح کہا ہے:

و (الكافر بسب نبي) من الأنبياء فإنه يقتل حدًا ولا تقبل توبته مطلقًا ولو سبّ الله تعالى قبلت لأنه حق الله تعالى والأول حق عبد لا يزول بالتوبة ومن شك في عذابه وكفره كفر

1 البحر الرائق: ۱۲۴/۵

''جہاں تک شاتم نبوت یا کسی اور نبی کے گستاخ کافر کا تعلق ہے تو اس کو بطور حد قتل کیا جائے گا، اور مطلقاً اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ تاہم اگر وہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرے تو اس کی توبہ مقبول ہوسکتی ہے کیونکہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے جبکہ پہلے جرم میں بندے کا حق بھی شامل ہے جو توبہ سے زائل نہیں ہوتا۔
جو شخص کافر کی اس سزا اور اسکے کفر میں شک کرے تو وہ بھی کافر ہو جاتا ہے۔''[1]

جہاں تک پاکستان میں مروّجہ قانون کا تعلق ہے تو اس کی رو سے تو جو شخص جس علاقے میں ہو، اس پر اس وقت وہی قانون نافذ ہوتا ہے۔ گویا قانون کا تعلق نظریہ وعقیدہ کی بجائے علاقہ وزمین سے جوڑ دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ فرانس میں بسنے والے مسلمانوں پر، ان کے شرعی اعتقاد کے برعکس فرانس کا امتناعِ حجاب کا جمہوری قانون نافذ ہوتا ہے اور پاکستان آنے والے غیر ملکیوں پر پاکستان کا قانون۔ اس بنا پر پاکستان میں جمہوری تقاضوں کے مطابق بننے والا یہ اسلامی قانون ملک کے تمام شہریوں پر بلا امتیاز لاگو ہوتا ہے، جن میں مسلمان اور ذمّیوں کا کوئی فرق موجود نہیں۔

## مروّجہ قانونی نظام میں توبہ کا مصرف؟

مذکورہ بالا نکتہ کو یہ بات بھی تقویت دیتی ہے کہ جرم وسزا کے پاکستان میں مروّجہ مغربی تصور کی رو سے، ریاست کو گناہ کی روک تھام سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے؛ یہ فرد اور اللہ کا باہمی معاملہ ہے۔ ریاست کا کام ہے جرائم کی روک تھام... جس پر کنٹرول کے سلسلے میں توبہ کا کوئی عمل دخل نہیں، بلکہ جرم کی دنیوی سزا ہی اس کو روک سکتی ہے۔ پاکستانی ریاست جرم وسزا کو اللہ اور بندے کے شرعی تعلق کی بجائے جمہوری نمائندوں کے طے کردہ انسانی قانون کے تناظر میں دیکھتی ہے جس میں توبہ کا کوئی مصرف نہیں۔ اس بنا پر مضمون نگار کا یہ قرار دینا کہ اہانت کے مجرم کو توبہ کا موقع فراہم کیا جائے، موجودہ قانونی تصور میں سرے سے ایک بے معنیٰ سفارش ہے۔

پھر کیا ایسا ممکن ہے کہ پاکستان میں چوری کرنے والا توبہ کے بعد مال واپس کرکے اپنی سزا ختم کروالے۔ جب کسی دوسرے جرم کے ضمن میں ایسی کوئی بات موجود نہیں تو پھر اللہ

1 الدر المختار از حصکفی: ۴؍ ۲۳۲

کے رسول ﷺ کی ناموس ہی اتنی ارزاں کیوں ہے؟ قانونِ توہین رسالت کو یہاں مروجہ دستوری تقاضوں کے عین مطابق نافذ کیا گیا ہے، اور یہ اس وقت پاکستان کا منظور شدہ مروجہ قانون ہے جس کی پابندی ہر شہری کو کرنا ضروری ہے۔

☜ جہاں تک اسلام کے قانونی تصور کا تعلق ہے تو اسلام میں بھی مجرم کے قاضی کے پاس آجانے کے بعد، توبہ کی بنا پر اُس کی دنیوی سزا سے معافی کا کوئی امکان نہیں ہے، جیسا کہ یہ بات صریح احادیث سے ثابت ہے، حتیٰ کہ مضمون نگار جو اس جرم کی اساس اہانت کی بجائے محاربہ کو قرار دیتے ہیں—جیسا کہ آگے آرہا ہے— کے سلسلے میں قرآنِ کریم کا حکم تو بالکل واضح الفاظ میں موجود ہے، کہ محاربہ میں توبہ کی بنا پر معافی کی گنجائش مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ سے مشروط ہے۔ اسلام میں عدالت کے علم میں آجانے کے باوجود توبہ کی گنجائش تو صرف ارتداد کے جرم میں ہے اور ارتداد ایک حد ہے جس کو توہین رسالت کی سزا کی اساس کے طور پر بھی مضمون نگار تسلیم نہیں کرتے بلکہ توہین رسالت کی سزا کی علت جرم محاربہ کو قرار دیتے ہیں، پھر نامعلوم کس بنا پر ایسے مجرم کو توبہ کی گنجائش کا موقف اختیار کیا جارہا ہے؟

☜ اوپر درج شدہ دونوں عنوانات پر اگر غور کیا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ پاکستان میں جاری نظامِ جرم وسزا اور مروّجہ قانون کے ہوتے ہوئے توہانتِ رسول کے حقیقی مجرم کے لئے کسی گنجائش کا کوئی امکان نہیں۔ تاہم اگر اس قانون کو فکری انتشار اور علمی بحران کا شکار کرکے نظر ثانی کے لئے بھیج دیا جاتا ہے تو نئی قانون سازی میں ان سفارشات کو پیش نظر لایا جائے گا اور اس بنا پر نئی قانون سازی کی جائے گی۔ راقم نے یہ ساری بحث اسی بنا پر فقہی تناظر کی بجائے قانونی اور معاشرتی تناظر میں کی ہے کہ اصل قانون تو اس وقت نافذ ہے جو ہر مجرم پر جاری ہے۔ توہین رسالت پر نئی بحثیں شائع کرنے کا اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں کہ قانون تبدیل کروانے کی فضا سازگار کی جائے، اس کے بعد یہ فقہی بحثیں قانون کی صورت میں مؤثر ہوکر سامنے آئیں گی۔ غرض یہ سفارشات اور فقہی مباحث مروّجہ قانون میں تبدیلی کے نقطہ نظر سے پیش کی گئی ہیں جس کے نتیجے میں حکومتِ وقت اس قانون کی اصلاح کے نام پر حدود قوانین کی طرح اس کو مسخ اور ناقابل سزا بنا کر چھوڑے گی، اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اس تناظر میں فقہ اسلامی کے نام پر کی جانے والی یہ متجددانہ کاوش

انتہائی قابل افسوس ہے!'

## اس باب میں فقہ حنفی کا معتبر موقف کیا ہے؟

راقم نے بغور ان مضامین کا مطالعہ کیا ہے جنہیں زیر نظر مجلہ میں شائع کیا جاتا رہا۔ ان مضامین میں کتاب وسنت کی ترجمانی کی بجائے فقہ حنفی کے تاریخی موقف کی تحقیق پیش کی گئی ہے کہ وہ امر واقعہ میں کیا تھا اور کیا نہیں؟ بہت مناسب ہوتا کہ اصل مسئلہ پر اتنی دادِ تحقیق دینے کی بجائے یہی توجہ قرآنِ مجید اور احادیث نبویہ سے استدلال پر صرف کی جاتی تاکہ یہ محنت جملہ اہل اسلام کے لئے مفید وبامقصد ہوتی۔ یا کم از کم فقہ حنفی کے دلائل اور جرم اہانتِ رسول کے سلسلے میں حنفی فقہا کے تجزیۂ جرم کو ہی پیش کر دیا جاتا ہے، لیکن اس کی بجائے صرف فقہ حنفی کے موقف کا تاریخی تعین ایک بہت جزوی نکتہ ہے۔ جہاں تک حنفی موقف کی بات ہے تو اس کے تعین میں خود مضمون نگار نے بے انتہا اضطراب کی نشاندہی کی ہے حتیٰ کہ بعض حنفی فقہا میں اس معاملے پر واضح تضاد بھی نظر آتا ہے۔ یہ اضطراب اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب سے لے کر مضامین ومقالات میں بھی موجود ہے۔

مزید برآں جب قومی سطح کی کسی قانون سازی کی بات ہو تو اس میں محض فقہ حنفی کی بنا پر قانون کی نظر ثانی کا مطالبہ فکری ترجیح اور فقہی جبر کا شائبہ دیتا ہے۔

فقہ حنفی کے حقیقی یا معتبر موقف کے بارے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ اس سے بالکل مختلف ہے جسے مضمون نگار نے اپنے مضامین میں پیش کیا ہے، جیسا کہ اس پر راقم کا ایک تفصیلی مضمون اسی شمارے میں شائع ہو رہا ہے۔

---

1 قانون امتناع توہین رسالت کے بارے میں حکومتی رجحان اور تازہ اقدام اس خبر سے واضح ہوتا ہے جو روزنامہ 'ڈان' میں ۲۴ جون ۲۰۱۱ء کو شائع ہوئی کہ "حکومت پاکستان نے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی زیر صدارت ہونیوالے اجلاس میں اقوام متحدہ کے 'کنونشن برائے عدم تشدد' UN Convention against Torture کی دفعات ۱۶، ۱۳، ۱۲، ۶، ۴، ۳ کے خلاف اپنے تحفظات واپس لے کر ان کے نفاذ اور پابندی کی منظوری دے دی ہے۔ واضح رہے کہ دفعہ نمبر ۶ پاکستان میں توہین رسالت پر سزائے موت کے نفاذ پر بعض سنجیدہ رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے جبکہ دفعہ نمبر ۳ کے ذریعے پاکستان میں خاندانی نظام کے ڈھانچہ کو محدود کرنے، مروجہ قانون شہادت اور صدر کے لئے مسلمان ہونے کی شرط وغیرہ پر اثرات عائد ہوتے ہیں۔ اسی طرح قادیانیوں کے پاکستان میں اسلامی تشخص وغیرہ پر بھی نظر ثانی کی توقع ہے۔" معلوم ہوا کہ حکومت خود عالمی اداروں سے توہین رسالت کی سزائے موت دینے کے خلاف معاہدے کر رہی ہے۔ اس کے بعد ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں!

اوّلاً، تو آج سے بیس برس قبل اس قانون کی تشکیل کے موقع پر وفاقی شرعی عدالت اور جمہوری رہنماؤں کے سامنے پاکستان کے تمام مکاتبِ فکر کا جو نمائندہ موقف پیش کیا گیا تھا، اس میں کسی اختلاف کا کوئی شائبہ نہ تھا، وگرنہ حکومت اس قدر واضح قانون سازی کرنے پر کبھی مجبور نہ ہوتی۔

☜ اس وقت حنفی علما کی اس قانون سے اختلاف نہ کرنے کی وجہ اس کے سوا کوئی نظر نہیں آتی کہ بعض علماے احناف کے ہاں دیگر اہل علم سے اگر کوئی اختلاف پایا جاتا ہے تو وہ فقط ذمّی کے مسئلے میں ہے اور چونکہ ذمّی کا ہونا اس دور میں متحقق نہیں اور نہ ہی پاکستان کے غیر مسلموں پر ذمی کا حکم لگایا جاسکتا ہے، اس بنا پر علمائے احناف نے بھی اُس سے کوئی اختلاف نہیں کیا تھا۔ اور یہ کہنا کہ حنفی اکابر فقہ حنفی کے اس اختلافی جزئیہ سے بے خبر یا غافل تھے، ایک طرف ان کے علمی مقام پر تہمت ہے تو دوسری طرف تاریخی حقائق سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس سے قبل ۱۹۳۰ء میں توہین رسالت کے مشہور غازی علم دین کیس کے موقع پر یہ بحثیں متحدہ ہندوستان میں اُٹھ چکی ہیں، جیسا کہ اس کی تفصیل مولانا عبد الماجد دریابادی کے مضمون مطبوعہ ۱۹۳۲ء میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

۲۵ برس قبل موقر حنفی مدرسہ جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث مولانا عبد المالک کاندھلوی نے اپنا موقف ان الفاظ میں شرعی عدالت کے سامنے پیش کیا تھا:

''اُمت کے تمام فقہا اور ائمہ مفسرین و محدثین کا فیصلہ ہے کہ توہین رسول اللہ کی سزا موت ہے۔.... علامہ شامی نے اس پر اُمتِ مسلمہ کا اجماع ذکر کیا ہے کہ جو بھی شخص آں حضرت ﷺ کی شان میں توہین کرے، اس کی سزا قتل ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ ائمہ اربعہ کا مذہب ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب اور سفیان ثوری، شام و عراق اور مصر کے تمام قاضیوں اور مفتیوں کا یہی فتویٰ عدالتوں میں نافذ و جاری رہا۔ توہین رسالت کے مرتکب شخص کے بارے میں تاریخ اسلام میں کبھی کوئی اختلاف نہیں پایا گیا اور صحابہ کے عمل سے بھی اس بات کا ثبوت ملا کہ اُنہوں نے ایسے مجرم کو سزائے موت دی اور آں حضرت ﷺ نے اس کی توثیق فرمائی۔ اس موقع پر ہم یہ بات واشگاف الفاظ میں کہنا چاہتے ہیں کہ اگر عدالتی سطح پر کسی ایک عدالت کا کسی مقدمہ میں فیصلہ نظیر قرار دیا جاتا ہے اور اسے عدالتیں نظیر قرار دے کر فیصلے کرتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ کا اجماع، تمام ائمہ کا اجماع،

اور سب سے بڑھ کر بارگاہِ رسول ﷺ سے صادر شدہ فیصلہ ہماری عدالت نہ مانے اور اس کے مطابق اس جرم کی سزا، سزائے موت تسلیم نہ کرے۔....

قرآنِ کریم کی سورۃ المنافقون کی آیت نمبر ۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی منافق تنہائی میں بھی آں حضرت کے متعلق صرف اتنی سی بات کرے کہ پیغمبر اور اس کے ساتھی ذلیل ہیں، عزت والے نہیں تو اُس کو مستحق قتل شمار کیا گیا۔"[1]

کراچی کے معروف جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاؤن کے ترجمان ماہنامہ 'بینات' کے مدیر مولانا محمد یوسف لدھیانوی نے اسی موقف پر ان الفاظ میں اپنا موقف پیش کیا:

"اسلامی قانون کی رو سے توہین رسالت کا مرتکب سزاے موت کا مستحق ہے اور اس مسئلہ پر تمام صحابہ و تابعین متفق ہیں۔ انگریز کے دورِ اقتدار میں ناموسِ رسالت کے تحفظ کے لئے کوئی قانون نہ تھا لیکن راجپال جیسے ازلی بدبختوں نے آں حضرت ﷺ کی عزت پر ناپاک حملے کئے اور وہ غازی علم الدین شہید جیسے فدائیانِ رسالت کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچے..."[2]

مجاہد ناموس رسالت جناب محمد اسمٰعیل قریشی کی کتاب 'ناموسِ رسول اور قانون توہین رسالت' جو اس قانون کی تشکیل [۱۹۸۲ تا ۱۹۹۲ء] کی مستند تاریخی دستاویز ہے، میں درجنوں علماے کرام کے فرامین اور اقوال کو درج کیا گیا ہے اور اس موقع پر کسی مکتبِ فکر نے اُمتِ اسلامیہ کے اس مرکزی موقف سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ جس کا اس کے سوا کیا مفہوم ہے کہ وہ سب اہل علم اس قانون کے اطلاق کو وسیع مانتے تھے اور موجودہ زمانے کے غیر مسلموں کو فقہی موشگافیوں کی بنا پر اس میں کوئی رعایت دینا اُنہیں گوارا نہیں تھا۔

ثانیاً، احناف کے اختلافی، کلاسیکی یا تاریخی موقف سے قطع نظر، جن کی روایات میں بھی اختلاف موجود ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ احناف کے پاکستان میں مفتیٰ بہ قول کو پیش نظر رکھا جائے۔ احناف کے مفتیٰ بہ قول کی روشنی میں ماضی میں پاکستان میں فیصلہ دیا جاچکا اور حال میں بھی پاکستان کے احناف کی اکثریت اسی کی قائل ہے، جیسا کہ نامور حنفی علما کا موقف اوپر بیان ہوچکا۔ علاوہ ازیں بریلوی مکتبِ فکر، جو حنفی فقہ پر ہی عمل پیرا ہے، کا اپنی



---

۱ 'ناموس رسول اور قانون توہین رسالت' از محمد اسمٰعیل قریشی: ص ۱۶۳، ۱۶۴

۲ ایضاً: ص ۱۵۳

بھرپور عددی اکثریت کے ساتھ موقف آج بھی وہی ہے جو پہلے تھا، اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ حتی کہ دیوبندی مکتبِ فکر جو حنفی فقہ کا ہی پیروکار ہے، کی اکثریت کا موقف بھی آج تک یہی ہے جسے اب تحقیق کے نام پر متاثر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ نامور بریلوی عالم مولانا احمد سعید کاظمی لکھتے ہیں:

''کتاب وسنت، اجماعِ اُمت اور تصریحاتِ ائمہ دین کے مطابق توہین رسول کی سزا صرف قتل ہے۔ رسول ﷺ کی صریح مخالفت، توہین رسول ہے۔ قرآن مجید نے اس جرم کی سزا قتل بیان کی ہے، اسی بنا پر کافروں کے قتل کا حکم دیا گیا ہے...
فتاویٰ قاضی خاں کے مطابق کسی شے میں حضور ﷺ پر عیب لگانے والا کافر ہے اور اسی طرح بعض علما نے فرمایا کہ اگر کوئی حضور ﷺ کے بالِ مبارک کو شعر کی بجائے 'شعیر' (بصیغہ تصغیر) کہہ دے تو وہ کافر ہو جائے گا اور امام ابو حفص الکبیر حنفی سے منقول ہے کہ اگر کسی نے حضور ﷺ کے کسی ایک بال مبارک کی طرف بھی عیب منسوب کیا تو وہ کافر ہو جائے گا۔''[2]

فاضل مضمون نگار نے ماضی میں جس طرح حدود قوانین کی نئی تعبیر پر ایک مستقل کتاب لکھ دی تھی، جسے بعد میں 'متجدد' اسلامی نظریہ کونسل نے شائع بھی کر دیا تھا، ان کی اس تحقیق سے سیکولر طبقات یا منکرین حدیث کے سوا معروف ونمائندہ اہل علم کو کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا، جیسا کہ اس کے بعد جامعہ مدنیہ لاہور کے مفتی ڈاکٹر عبدالواحد حفظہ اللہ اور مولانا عبدالقیوم حقانی سمیت وفاق المدارس العربیہ کے ترجمان ماہ نامہ 'وفاق المدارس' ملتان میں اس کے خلاف تردیدی مضامین شائع کئے گئے۔ ان حضرات نے حدود قوانین پر اس متجددانہ موقف کی پرزور تردید کی تھی، پتہ چلا ہے کہ اب بھی مفتی صاحب موصوف اس مسئلہ پر مفصل تردید لکھ رہے ہیں۔ بہر طور حنفیت کی یہ تازہ تحقیق بھی وقت گزرنے کے ساتھ اپنی حیثیت واضح کرے گی کہ کیا یہی پاکستان کے احناف کا مفتیٰ بہ قول ہے یا نہیں؟ سردست اسے حنفیت کے نام پر ایک 'محققانہ ندرت' ہی قرار دیا جاسکتا ہے۔

انہی دنوں جناب مضمون نگار کے سگے چچا مولانا عبدالقدوس قارن بن مولانا سرفراز خاں



---

۱ دیکھئے محدث شمارہ فروری ۲۰۱۱ء میں شائع شدہ مضمون: 'مسئلہ توہین رسالت پر علماے احناف کا موقف' از علامہ محمد تصدق حسین اور کتابچہ 'گستاخِ رسول کی سزا اور فقہاے احناف' از مؤلف مذکور

۲ 'ناموس رسول اور قانون توہین رسالت' از محمد اسمٰعیل قریشی: ص ۱۵۶، ۱۵۸

صفدر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں حنفیت کی اس نادر تحقیق کی بھرپور دلائل کے ساتھ تردید کی گئی ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں کہ "احناف کے نزدیک اس کی حد قتل نہیں ہے، پاکستان میں اکثریت احناف کی ہے، اس لئے ان کے نظریہ کے مطابق اس کی حد قتل نہیں ہونی چاہئے۔" مولانا قارن رقم طراز ہیں:

"یہ اعتراض مکر و فریب کا جال اور احناف کے مسلک سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ اس مسئلہ میں احناف کی بعض عبارات کو لے کر تحفظِ ناموس رسالت قانون میں تبدیلی کرنے والے مفاد پرستوں کو کبھی خیال نہیں آیا کہ ۱۹۵۶ء سے نافذ 'عائلی قوانین' بھی تو احناف کے نظریے کے خلاف ہیں، ان کو تبدیل کروانے کے لئے کیوں آواز نہیں اُٹھائی جاتی حالانکہ ان میں سے بعض مسائل میں نوبت واضح حرام کے ارتکاب تک جا پہنچتی ہے۔ پھر یہ بھی غلط بیانی ہے کہ گستاخ رسول کی حد قتل کی صورت میں احناف کے نظریہ کے خلاف ہے۔ اس پر یہی دلیل کافی ہے کہ اس قانون کو منظور کروانے والوں میں حنفی دیوبندی مکتب فکر کے جید عالم دین استاذ المحدثین حضرت مولانا عبد الحق صاحب، اکوڑہ خٹک والے بھی تھے جن کی تدریسی خدمات نصف صدی سے زائد ہیں اور ان کے سینکڑوں شاگرد شیخ الحدیث اور استاذ الحدیث کے مناصب پر فائز ہیں۔ اور حنفی بریلوی مکتب فکر کے نامور عالم دین علامہ عبد المصطفیٰ ازہری تھے جو اپنے طبقہ میں مایہ ناز مدرس اور مفتی تھے۔ پھر ان کو اپنے اپنے طبقہ کے تمام علمائے کرام کی حمایت بھی حاصل تھی۔ اگر یہ قانون حنفی نظریہ کے مخالف ہوتا تو اس کو حنفی علما کی حمایت حاصل نہ ہوتی جبکہ کسی ایک قابل شمار عالم کی مخالفت میری نظر سے نہیں گزری۔ موجودہ دور کے احناف سے پہلے بھی فقہائے احناف گستاخ رسول کے قتل کا ہی نظریہ رکھتے تھے۔"[1]

یاد رہے کہ مجلّہ 'الشریعہ' کے شمارہ جون میں پاکستانی احناف کے انتہائی معتمد عالم مولانا مفتی رفیع عثمانی کا ایک مضمون بھی شائع کیا گیا تھا جس میں مولانا نے ذمّی کے ساتھ ساتھ توہین رسالت کے مجرم کے لئے توبہ کی گنجائش کا امکان پیش کیا تھا۔ لیکن مجلہ مذکور کے شمارۂ اگست میں مولانا عثمانی نے اس موقف کی اپنی طرف نسبت پر تردّد کا اظہار بایں الفاظ کیا ہے،

1 ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ شمارہ اپریل ۲۰۱۱ء اور مجلّہ صفدر گجرات، شمارہ نمبر ۵، ص ۲۱

جس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ مجلّہ مذکور میں شائع ہونے والے موقف سے متفق نہیں:

"آپ حضرات کی ذمہ داری ہے کہ آئندہ شمارے میں اس بات کی واضح تردید کردی جائے اور یہ واضح کیا جائے کہ یہ مضمون غلطی سے حضرت کے نام سے شائع کیا گیا ہے اور حضرت کو اس مضمون سے مکمل اتفاق بھی نہیں ہے۔"[1]

راقم نے علماے احناف کے حقیقی اور کامل موقف کی وضاحت کے لئے ایک مستقل مضمون ترتیب دیا ہے جسے مستقل طور پر عنقریب شائع کیا جائے گا۔ جہاں تک مضمون نگار کے توہین رسالت پر بیان کردہ موقف کا تعلق ہے تو وہ کسی طرح حنفیت کی ترجمانی نہیں کرتا، بلکہ وہ سراسر جاوید احمد غامدی کے موقف کی نمائندگی پر مبنی ہے جس کی تفصیلات اسی شمارے میں مستقل طور پر شائع کردی گئی ہیں۔

غامدی فرقے نے آسیہ مسیح کیس کے موقع پر سات ماہ قبل حنفی موقف میں اضطراب کا شوشہ چھوڑا تھا، اور اس کے بعد جاوید غامدی کے اپنے قلم سے اس موضوع پر تین مضامین کے علاوہ مجلّہ اشراق میں متعدد ایسے مضامین بھی شائع ہوچکے ہیں جن میں حنفی موقف کی من مانی تحقیق کو اُچھالا جارہا ہے۔ عین انہی دنوں مجلّہ الشریعہ میں بھی نہ صرف نصف درجن کے قریب اسی موضوع پر مضامین شائع ہوئے، بلکہ مدیر مجلہ نے ایک تفصیلی تحقیق مستقل کتابچہ کی صورت میں بھی شائع کردی ہے جس کو بعد ازاں روزنامہ پاکستان نے بڑے پیمانے پر شائع بھی کیا ہے۔ اس موقع پر اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے بعض پروفیسر صاحب حنفیت کی اسی تحقیق کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کی 'دینی خدمت' بھی سرانجام دے رہے ہیں۔ جاوید غامدی کے توجہ دلانے سے قبل ماضی میں حنفیت کے نام پر یہ تحقیق کہیں نظر نہیں آتی، اس سے بھی اس سارے منظر نامے کے مقاصد ورجحانات کا بخوبی علم ہوجاتا ہے۔ ان تمام کاوشوں کا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں کہ جاوید غامدی کے الحادی موقف کو مسلمانانِ پاکستان کے اتفاقی موقف کے بعد، نام نہاد تحقیق کے ذریعے مسلط کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو اس سازش کو سمجھنے اور اس کا مدافعت کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!



---

۱ مراسلہ از مولانا عبدالرؤف کھروی، مؤرخہ ۲۳ جون ۲۰۱۱ء، مطبوعہ زیر عنوان 'مکاتیب'